بسم اللہ الرحمن الرحیم

زادِ حرف

نعیم گیلانی نے نصرت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
انحراف پبلی کیشنز
C/1۔ ایل ڈی اے پلازہ۔ 55۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کی

Author :
Ashraf Naqvi
Bikhee Road, Khokhar Town
SHEIKHUPURA.
e-mail:naqvi.ashraf@gmail.com
www.facebook/ashrafnaqvi
Cell No. 0345 63 52 439

زادِ حرف

اشرف نقوی

انحراف پبلیکیشنز لاہور، اسلام آباد

انحراف
PUBLICATIONS

اہتمامِ اشاعت : نرگس حفیظ، نعیم گیلانی

طبع اول : جنوری 2015

سرورق : جلیل حسنین شاہ

ترتیب و زیبائش : قاسم حسن گیلانی

مشقی خطاطی : حسنین نقوی

تعداد : پانچ سو

"ZAAD E HARF"
(Urdu poetry by **Ashraf Naqvi**)
printed by :
Shirkat printing press
43/Nisbat Road Lahore.
Price : Rs. 350/- (20.00 $)
Publish by :
"INHRAAF PUBLICATIONS"
C/1 LDA Flats 55. lawrance Road,
LAHORE
Cell : 0333 650 92 04
H/n 106 St/13 Phase 1 Margla Town,
Islamabad.
Cell ; 0300 514 57 43
Email:
Inhiraaf_publication@yahoo.com

PUBLICATIONS

اِنتساب

اپنی ہم خانہ و ہم نصیب

روبینہ بخاری

اور پیاری بیٹی

شافعہ بتول کے نام !!

زادِ حرف

آگر ہے عشق تو پھر اتنا ضروری ہے
سو بندگی کے لئے بھی محمدؐ ضروری ہے

میں "زادِ حرف" لئے اپنے گھر سے نکلا ہوں
تو مال و زر بھی مرے پاس کیا ضروری ہے !

حسنِ ترتیب

اشرف نقوی کا استعاراتی نظام

اشرف نقوی کا شمار اکیسویں صدی میں نمایاں ہونے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق شیخوپورہ سے ہے۔ ان سے پہلے شیخوپورہ سے شاہین عباس، ارشد نعیم اور نوید رضا اپنی شعری صلاحیتوں کی داد اہلِ ادب سے وصول کر چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مضافات کے شعرا دوسرے درجے کے تھے اور ادبی منظر نامے پر لاہور اور کراچی کی حکمرانی تھی۔ گلوبلائزیشن نے عمومی طور پر انسانی شعور میں جو اضافہ کیا ہے، بڑے شہروں اور مضافات کی تفریق کا خاتمہ بھی اس میں شامل ہے۔ اب اہلِ ہنر کہیں بھی بیٹھ کر اپنے جوہر کے اظہار میں تمام دُنیا کو شریک کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ساہیوال، سیالکوٹ، اوکاڑہ، بہاولنگر، گجرات، بھکر وغیرہ شہروں اور علاقوں کے شعرا بھی ادب کے مرکزی دھارے میں شامل ہو گئے ہیں۔

ہمارے زمانے تک آتے آتے اصناف اور اسالیب تجرباتی دَور سے نکل کر تخلیقی دَور تک آ گئے ہیں۔ اب نئے شاعر ہیئتی اور اُسلوبی تجربات کی بجائے تخلیقی تجربے کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک زمانے میں بعض موضوعات اور رویوں کو غیر ادبی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے نئے شاعر ان مسائل سے بھی باہر نکلے ہیں۔ اب وہ ہر اُس موضوع اور رویے کا الزام اُٹھانے کے لیے تیار نظر آتے ہیں جو تخلیقی تجربے میں اپنی فطری قوت سے اظہار پذیر ہوتا ہے۔ میں اشرف نقوی سے ذاتی طور پر تو واقف نہیں ہوں لیکن ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مذہبی ذہن رکھنے والے انسان ہیں۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک شاعر و ادیب کے لیے مذہبی ہونا خامی سمجھا جاتا تھا اور اُس کا تخلیقی جوہر مشکوک سمجھا جاتا تھا، لیکن اکیسویں صدی کا شاعر ایسی تمام غیر فطری جابلانہ آرا سے بھی بے نیاز ہو گیا ہے اور اپنے باطن کے انکشافات کو فطری انداز میں شعر میں ظہور پذیر ہونے کا ہر موقع فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس دور کی شاعری میں ظہور پذیر ہونے کا باطن کے زیادہ شفاف اظہارات دیکھنے کو ملے ہیں۔ اشرف نقوی کی شاعری میں مذہبی شعور کا اظہار صرف اُن اشعار میں ہی

نہیں ہوا جس میں مذہب کی پیدا کردہ تہذیب سے تلمیحاتی وغیر تلمیحاتی اِستعارات وضع کیے ہیں بلکہ اُن کی ساری شعری منطق اور تخلیقی تجربہ اِسی مخصوص شعور کے زیرِ اثر کارفرما ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اشرف نقوی کا استعاراتی نظام اُن کے اِسی مذہبی شعور کا زائدہ ہے۔ اُن کے ہاں واقعۂ کربلا سے منسلک اِستعارے فراوانی سے اِستعمال ہوئے ہیں۔ ہمارے عہد کو بیان کرنے کے لیے یہ بہترین اِستعارے ہیں، کیوں کہ اِس زمانے میں حق کو وہی مسائل درپیش ہیں جو حق کا اِستعارہ ہیں اور جو میدانِ کربلا میں اہلِ حق کو درپیش تھے۔ آج بھی اِقتدار پرستی اور اِس سے پیدا ہونے والے منفی رویوں نے ہماری زندگی کو اِسی طرح بدصورت بنا دیا ہے، جیسا آج سے چودہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ یہ اِستعارات ہمارے اِنسان کی بے بصری اور بے بسی کی داستان بھی سُناتے ہیں جو صدیوں پہلے جیسا بے بضاعت اور بُزدل تھا، آج بھی ویسا ہی ہے اور اِسی وجہ سے تباہ حال ہے۔ مُٹھی بھر اِنسان ہمیشہ سے ظلم اور اِستحصال کے خلاف نبرد آزمائی کرتے آئے ہیں۔ اگرچہ بہیمیت اور حیوانیت کو وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو جاتی ہے لیکن آخر فتح ہمیشہ حق کو ہی حاصل ہوتی ہے:

نیزے پہ سر ہے اور بدن تپتی ریت پر　　　مقتل سے ہو کے نکلے ہیں عزت مآب ہم

سہا وہ ظلم کہ اب کچھ پتہ نہیں چلتا　　　ہمارے ہاتھ قلم ہیں کہ سر بُریدہ ہیں

بُلایا اِتنے تسلسل سے اہلِ کوفہ نے　　　مجھے نکلنا پڑا آخرش مدینے سے

دشت ہے، دریا ہے اور فوجِ یزید　　　کربلا ئے بے اماں ہے اور میں

پہلے تو ہمیں مارا گیا دشت میں لا کر　　　اور بعد میں اِک خلق عزادار ہوئی ہے

اشرف نقوی کے اِس مجموعے میں کربلا کے علاوہ بھی ہمارے مجموعی مذہبی اور تہذیبی ورثے سے متعدد اِستعارات وضع ہوئے ہیں۔ یہ اِستعارے جہاں ان کے اِجتماعی شعور کی عکاسی کرتے ہیں، وہاں ان کے ذہن کی خاص ساخت کو بھی بیان کرتے ہیں جو زندگی کا جائزہ مخصوص اساطیری فضا میں لیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام انھوں نے شعوری سطح پر نہیں کیا بلکہ یہ خود بخود تخلیقی عمل کا حصہ بن کر ہوا ہے۔ اِس لیے اِس کی معنویت میں اور بھی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ ہر شاعر اِستعارات ہمیشہ اپنے تہذیبی ورثے سے ہی اخذ کرتا ہے:

ملے گی کوئی زلیخا تو دیکھا جائے گا — ابھی تلک تو ہماری قبا سلامت ہے

آیتِ حُسن کی تلاوت کو — حُسنِ تفسیر سے الگ رکھا

کشتیِ نوح بھیج دے یا رب — میری بستی میں آ گیا پانی

کیا فرشتوں نے سجدہ بروزِ صُبحِ ازل — تمہیں خبر ہے کہ ہم کتنے برگزیدہ ہیں

گرچہ ملائکہ نے فسادی بشر کہا — پھر بھی مجھے خدا نے اُتارا زمین پر

ہوئی جس روز سے آباد مجھ سے — زمیں پر آئی ہے اُفتاد مجھ سے

مُجھ کو مرے مولا میری اوقات میں رکھنا — پھیلاؤں نہ پاؤں کبھی چادر سے زیادہ

اشرف نقوی کی شاعری میں "کُن" کا استعارہ بھی تواتر سے آیا ہے۔ ہماری تہذیبی فکر میں تخلیقِ کائنات، تخلیقِ آدم اور ہبوطِ آدم کے قصوں کو انسان، کائنات اور خدا کی تفہیم میں بنیادی استعاروں کی حیثیت حاصل ہے اور ہمارے تمام ہی شاعروں نے انہیں کسی نہ کسی صورت اور کسی نہ کسی حد تک برتا ہے۔ اشرف نقوی کی شاعری میں جہاں یہ تخلیقی رویوں کی آرزو کا اظہار ہے وہاں موجودہ دور کے تخلیقی بنجر پن کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ مالیاتی کارپوریشنوں نے جس نئے گلوبلائزڈ کلچر کو دُنیا سے متعارف کروایا ہے اس میں انسان کی حیثیت شے سے زیادہ نہیں رہی۔ اِس نظام میں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوا ہے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ خدا کا ایک مجہول تصور دیا جائے جو امیروں کے مطابق عمل کرتا ہو اور انسانوں کو تقدیر کا غلام بنا دیا جائے۔ علامہ اقبال کی ساری شاعری اِس نظریے کے خلاف تھی اور وہ خدا اور مذہب کے طاقت و تصور کے قائل تھے جو انسان کو راضی بہ تقدیر کرنے کے بجائے اس کو تقدیر پر تصرف عطا کرے۔ اشرف نقوی کی آرزوئے کُن بھی اِسی رویے کی آئینہ دار ہے۔ وہ اس نظامِ زندگی کو ختم کر کے ایک نئی دُنیا بنانے کے خواہش مند ہیں:

میں نہیں تھا جب عالمِ کُن میں — تب بھی منظر میں جلوہ گر تھا میں

وقت سے کہہ دو کہ وقت میں تبدیل نہ ہو — میں ابھی کُن کی ہوں تفسیر سے بندھ کر بیٹھا

اے خدا! پھر سے اِک صدائے کُن — میرا ہر زیر و بم ادھورا ہے

میرا ہونا اِس عالمِ کُن میں — باعثِ افتخار تجھ سے ہے

جو کوئے آج بھی اشرف صدائے کُن پھر سے — تو اِک جہان نیا لامکاں سے آتا ہے

اِستعارے کا ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ ہر شعر میں یہ اِنفرادی معنویت کا حامل ہوتا ہے اور مجموعی طور پر ایک کُلّی معنویت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں ''کُن'' ہر شعر میں ایک الگ معنویت کا اِظہار ہے لیکن مجموعی طور پر اپنے عہد کی صورت کو بھی پیش کرتا ہے۔ اشرف نقوی کے اِس مجموعے میں کچھ اور اِستعارات بھی ہیں جو بظاہر مختلف ہیں لیکن مجموعی طور پر شاعر کے نظریۂ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اِن اِستعاروں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام ہی چمک دار اور روشن اِستعارے ہیں جو شاعر کی اِس تمنا کی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ موجودہ زندگی کے تاریک منظر کو روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اِن میں سے بیشتر اِستعارے وجودی طور پر روشن ہیں لیکن ایسے بھی ہیں جو معنوی طور پر چمکدار ہیں جیسے خواب، خواب کا دُھندلا پن اور ابہام اپنے باطن میں ایسا تخلیقی جوہر لیے ہوئے ہیں جو روشن زندگی پر منتج ہوتا ہے۔ خواب، ہر تخلیق اور تخلیقی رویے کا بنیادی جوہر ہے اور زندگی کے سفر کو آگے بڑھانے کا باعث ہے۔ یوں تو تمام ادب اور فنونِ لطیفہ کا بنیادی جوہر ہی خواب ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد کی شاعری میں یہ اِستعارہ بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ اپنی معنویت تبدیل کرتا رہا ہے اور اُردو شاعری کا قاری آسانی سے اِس اِستعارے کے مطالعے سے تاریخِ پاکستان مرتب کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ پاکستان اپنے پینسٹھ سالوں میں کن کن نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں چراغ، آئینہ، سورج، ستارے، آنسو اور دیگر کئی ایسے ہی اِستعارے اِس مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں:

آبِ رواں پہ گو کہ ہیں مثلِ حباب ہم — رکھے ہوئے ہیں آنکھ میں صدیوں کے خواب ہم

دیے نے بھی کنارہ کر لیا ہے — ستارہ بھی ہوا ناشاد مجھ سے

اُسے بھی گھیرا ہوا ہے ہواؤں نے اشرف — جو اِک چراغ شبِ تار کی طرف آیا

سورج کے سامنے تو نہیں کوئی شے مگر — چمکیں گے ہم ضرور شبِ تار میں میاں

عکس ہوں میں، تُو میرا آئینہ — تیری حیرت سنوارتی ہے مجھے

دھو ڈالیے لب اشکوں سے ساری زمینِ دل — یہ ہی تو اِس حرم کی صفائی کا وقت ہے

اشرف نقوی کے اِس مجموعے کی ایک اور نمایاں خصوصیت شاعر کی فراق پسندی ہے۔

ہماری شاعری میں عمومی رویہ وصال پسندی کا ہے۔ کلاسیکی دور میں اس کی ایک مابعد الطبیعاتی معنویت بھی تھی۔ وصال دراصل وہ منزل تھی جس تک پہنچنا مقصود تھا۔ ہماری شعری روایت میں صرف اقبال وہ شاعر ہے جس نے وصال کے بجائے فراق کو زیادہ بڑی قوت کے طور پر دریافت کیا:

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ، ہجر میں لذتِ طلب

وصال ہماری شاعری میں منزل کا استعارہ ہے جب کہ اقبال کسی ایک منزل پر اکتفا کرنے والے شاعر نہیں تھے بلکہ منزل کو جمود سمجھتے تھے اور مسلسل سفر، مسلسل حرکت اور مسلسل جدوجہد کو زندگی سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ فراق کو وجود کا اثبات اور وصال کو نفی سمجھتے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں فراق کو زیادہ بلند مقام حاصل ہے۔ وہ ابلیس کو خواجۂ اہلِ فراق کہتے ہیں اور زندگی کے تحرک کا باعث سمجھتے ہیں۔

ہمارے موجودہ شعری منظر نامے میں اشرف نقوی ایسے شاعر ہیں جو فراق پسند نظر آتے ہیں۔ ان کے اس رویے کے پس منظر میں کچھ دیگر محرکات نظر آتے ہیں۔ ان کا جائزہ لینے سے پہلے چند شعر دیکھیے:

مجھے خبر ہے کہ ہوتا ہے کیا فراق کا دُکھ — میں وہ ستارہ ہوں جو کہکشاں سے باہر ہے
ہجر نے ہی تو مجھے وصل کی آسانی دی — قرب ورنہ ترا آسان کہاں تھا پہلے
عشق نے جب خراج مانگا تو — ہجر کا فیصلہ کیا میں نے
خواہشِ وصل کو صورت سے وہ عطا کر دی ہے — ہجر پائندہ رہے، ہم نے دُعا کر دی ہے
ہجر ہے اِک حقیقتِ ابدی — وصل کا لمحہ کتنا فانی ہے
ہجر معراج ہے محبت کی — اور محبت وصال میں خوش ہے
شامِ وصال میرے مقدر میں تھی مگر — اِک ہجر اپنے نام کیا اور چُپ رہا

فراق کی ردیف میں لکھی ہوئی غزل کے علاوہ بھی اس مجموعے میں درج متعدد اشعار ہجر کے حوالے سے مل جاتے ہیں جو شاعر کی ہجر آشنائی کی خبر دیتے ہیں۔ اقبال نے ہجر کو فلسفہ اور نظریہ

حیات بنا دیا ہے جب کہ اشرف نقوی کی شاعری میں ہجر عدم رسائی کا استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ایسے ہی دور میں ممکن تھا جب زندگی ہی انسان کی رسائی سے باہر نکل گئی ہے اور اس کے حصول کے لیے انسان کو اپنی آرزوئیں، تمنائیں، آدرش اور ایمان قربان کرنے پڑتے ہوں، اس لیے عزتِ نفس رکھنے والے لوگ اور شاعر ہجر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ غزل کا شاعر زندگی کی عکاسی استعاروں میں کرتا ہے اس لیے اس کا بیانیہ براہِ راست نہیں ہوتا اور شاعرانہ عناصر سے مالا مال ہوتا ہے۔ اشرف نقوی نے مختلف استعاروں میں، جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے ہوا ہے، سماجی زندگی کی عکاسی بھی کی ہے اور ایک اعلیٰ تخلیقی و انسانی زندگی کی آرزو بھی اپنے قاری کو دی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری ہمیں براہِ راست متاثر کرتی ہے۔

اشرف نقوی نے Paradox / قولِ محال اور اگر روایتی زبان میں بات کی جائے تو صنعتِ تضاد سے اتنا کام لیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی منطق ہی اس صنعت سے ماخوذ ہے۔ ویسے تو پوری کائنات کا وجودی اصول یہی ہے۔ خیر شر، نیکی بدی، دن رات، جھوٹ سچ سے لے کر ایٹم کے منفی اور مثبت چارج تک کائنات اسی تضاد سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ اشرف نقوی کے ناقابلِ شمار اشعار اسی شعری کمال سے وجود حاصل کرتے ہیں:

خاموشی سے کلام کیا اور چپ رہا — میں نے سخن مدام کیا اور چپ رہا
کہیں اپنے اُجالوں کو نہ کھا لے — اندھیروں سی لپٹتی روشنی بھی
ہجرت و ہجر کی فراوانی — زندہ رکھتی نہ مارتی ہے مجھے
دن گزارا ہے ایک ہی پل میں — شب صدی کی طرح جاتی ہے
خوشی کو چھوڑ کے آزار کی طرف آیا — میں ایک دشت سے گھر بار کی طرف آیا

یہاں میں نے درجنوں اشعار میں سے چند شعر درج کیے ہیں، کیوں کہ اس سے زیادہ شعر نقل کرنا ممکن نہیں ہے لیکن اشرف نقوی کی بعض غزلوں میں کئی اشعار اور تقریباً ہر غزل میں ایک آدھ شعر ضرور ایسا ملتا ہے جس میں اس ہنر سے کام لیا گیا ہے۔

آخر میں ایک بات اشرف نقوی کے شعری آہنگ کے بارے میں۔ اشرف نقوی نے تقریباً پچاس فیصدی غزلیں چھوٹی بحر میں کہی ہیں۔ طویل بحر میں ایک غزل بھی نہیں ہے۔ ان کے اس

مجموعے میں متعدد مقامات پر میرؔ سے عقیدت و محبت کا اظہار بھی ہوا ہے لیکن انھوں نے مختصر بحور کے تجربے کو ہی زیادہ اختیار کیا ہے۔ یہ محض میرؔ پسندی نہیں ہے کیوں کہ اوزان و بحور و آہنگ کسی بھی شاعر کے اسلوب کا سب سے پیچیدہ انتخاب ہوتا ہے جس میں شاعر کے تخلیقی مزاج، اس کے موضوعات اور شعری فضا کو بھی دخل حاصل ہوتا ہے۔ عام طور پر چھوٹی بحریں کیفیاتی شاعری کے لیے زیادہ موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ ہماری عشقیہ مثنویوں کی بحور بھی عموماً مختصر ہی ہوتی تھیں، شاید یہ اس لیے بھی ہو کہ اشرف نقوی کی شاعری کا مرکز عشق ہے اور اس حوالے سے انھوں نے زندگی کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

اشرف نقوی کا یہ مجموعہ ان کے مجموعی تخلیقی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میں ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں۔ میرا سارا تعلق ان کی شاعری کے حوالے سے ہے اور میں ان کی ذات، شخصیت اور تخلیقی تجربے سے اس آئینے کے ذریعے واقف ہوا ہوں۔ ان کی شاعری اس متغیر صورتِ حالات میں ثبات کی آرزو کی آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر ضیاءُ الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج

لاہور

۱۱ ستمبر ۲۰۱۲ء

اشرف نقوی

نہ جانے کیوں میں جب بھی اشرف نقوی کو دیکھتا ہوں تو مجھے امام بخش ناسخ یاد آجاتے ہیں۔ اُسی طرح دیکھنے میں پہلوان، پرکھنے میں نوجوان ہیں ان کے کلام پہ نظر کریں تو معیار تاری کی بلائیں لینے لگتا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ ایسے لطیف خیالات، اِتنے نادر اِستعارے، ایسی اچھوتی تشبیہات، ایسے ناقابلِ یقین امکانات ایسی عظیم جسامت کے ساتھ کیسے کر لیتے ہیں؟

اِس کی سب سے بڑی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اشرف نقوی نے بیس بائیس سال کی ریاضت کے بعد قارئینِ اُردو ادب کو ۲۰۰۲ء میں "آخرش" کا تحفہ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "سبحان اللہ"، "شاباش" اور "واہ واہ" جیسی صدائیں لگاتار ان کے مشامِ جاں کو معطر کرتی رہیں۔ اب بھی اِن کی ہمت ہے کہ "کاتا اور لے دوڑی" کے اِس عہد میں انہوں نے نو سال کے طویل وقفے کے بعد "زاوِ حرف" کی صورت میں قارئینِ ادب کے ذہنوں پر پھر دستک دی ہے۔ اِن نو سالوں میں اچھی شاعری کے تعاقب میں اشرف نقوی نے وہ دشت نوردی کی ہے کہ انہیں دیکھ کر مجھے ن م راشد کا "حسن کوزہ گر" یاد آجاتا ہے۔ جو اپنی جان سے پیاری جہاں زاد کو مخاطب کر کے اپنی ہزیمتی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

جہاں زاد! نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دُکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی تھی،
میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!
جہاں زاد!!! نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں

میرے ایک بے تکلف دوست، ایک دن اِن کی ظاہری جوانی کو دیکھ کر فرمانے لگے:

"تمہارے اِس دوست نے غلط شعبے کا انتخاب کیا ہے۔ یہ اگر آنکھیں بند کر کے بھی دادا گیری کی طرف آ جاتا تو پورے علاقے کے کن ٹٹے اس کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے"۔

میں نے عرض کیا:

"دیر نہ جا رکھو میرے دوست! یہ اگر اِس میدان میں بھی اِسی استقامت سے ڈٹا رہا تو بہت جلد اِس کی اپنی نسل کے بے شمار شاعر ادیب اِس کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک
یکم جنوری ۲۰۱۵ء

خود کلامی!

میں کون ہوں؟ اِس سوال کا جواب مجھے طویل سفر، ریاضت اور تپسیا کے بعد حاصل ہوا۔ خیال کی پُر خار وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے میرے پاؤں میں آبلے پڑے، دامن جھاڑیوں میں اُلجھا، چہرہ اور ہاتھ بھی زخمی ہوئے لیکن میں نے اپنی تلاش کا سفر جاری رکھا۔ اپنی تلاش اور کھوج میں نکلنا اور پھر مُستقل مزاجی سے جنگلوں، صحراؤں، بستیوں، بیابانوں اور ویرانوں کی خاک چھاننا کوئی کارِ آسان نہیں، لیکن منزل کی جُستجو اور خود کو پا لینے کی آرزو اور لگن سر پر ایسی سوار رہی کہ مسلسل بیس برس تک میں رات دن کی پروا کیے بغیر چلتا رہا، چلتا رہا اور آخر کار ایک روز مجھ پر اِنکشاف ہوا کہ میں تو اپنے پاس ہی موجود ہوں۔ مجھ پر یہ حقیقت آناً فاناً منکشف ہوئی۔ کچھ دیر تو میری آنکھیں خیرہ رہیں، پھر آہستہ آہستہ آنکھیں روشنی کی عادی ہوئیں تو دیکھا کہ میں ایک نئے سانچے میں ڈھلا ہوا ایسا اِنسان ہوں جس پر شعر و سخن کی دیوی مہربان ہے۔ سو میں نے اپنی پہچان اور شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے ''آخرش'' کی صورت میں اپنے شعری تصور کو پیکرِ کتاب میں ڈھالا۔ ''آخرش'' نے مجھے میرے ہونے نہ ہونے کے مخمصے سے نکالا اور مجھے بتایا کہ تم ہو۔ اپنے ہونے کا یقین کر لو اور پھر سے نئی منزلوں کی جُستجو اور تلاش کا سفر شروع کرو۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے کمر ہمت باندھی اور ایک بار پھر نئے سفر پر نکل کھڑا ہوا، لیکن یہ سفر پچھلے سفر کی مانند پُر خار وادیوں کی بجائے ہموار اور نسبتاً آرام دہ راہوں پر جاری رہا۔ اب یہ سفر تو تا دمِ آخر جاری رہنا ہے لیکن کچھ دیر ٹھہرنے اور ستانے کو سفر

موقوف بھی کرنا پڑتا ہے۔ اب چونکہ میں اپنے آپ کو کسی حد تک پہچاننے بھی لگ گیا ہوں اور کسی حد تک راستوں سے آشنائی بھی ہوگئی ہے تو میں نے سوچا کہ کچھ دیر پڑاؤ کر لیا جائے۔ سو اِس پڑاؤ میں "آخرِش" کے بعد کے سفر کی روداد سنانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب "زادِ حرف" میرے اسی سفر کی روداد ہے۔ آپ کو یہ روداد کیسی لگی؟ اِس کا فیصلہ تو آپ اِس کے مطالعے سے خود ہی کر سکیں گے۔ میں بہرحال اپنی رفتار سے مطمئن ہوں۔

مجھے اپنے شعری سفر میں جن احباب کا تعاون اور مدد حاصل رہی، میں اُن کا فرداً فرداً ممنون و متشکر ہوں اور اُن کے لیے دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار اور دُعا گو ہوں۔ میرے ان احباب میں برادرم ارشد نعیم، شاہین عباس، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر خالد ندیم، نوید رضا، اصغر علی جاوید، پروفیسر محمد اکرم سعید، اظہر عباس، نعیم گیلانی، پروفیسر علی آصف، پروفیسر محمد اکرم سرا، پروفیسر صدیق شاہد، سیّد اعتبار حسین عابدی اور پروفیسر خرم ورک جیسے سخنور اور سخن شناس دوست شامل ہیں جنہوں نے علمی و ادبی تنظیم "دریچہ" کی صورت میں رفاقتوں اور محبتوں کا ایسا خوب صورت اور دلکش حلقہ قائم کر رکھا ہے جس سے نکلنے کا تصور بھی میرے لیے محال ہے۔ اِن سب دوستوں نے میرے ادبی اور شعری سفر کے مختلف مراحل پر جس طرح میری رہنمائی اور پذیرائی کی، وہ میرے لیے اثاثۂ حیات ہے۔ ایک اور اہم شخصیت جس کا مجھے خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا ہے وہ میری شریکِ حیات سیّدہ روبینہ بخاری ہے جس نے مجھے گھر میں شعر و ادب کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا اور شعر و سخن کے تسلسل کے لیے میری ہمت بندھائی۔

آخر میں صرف یہی کہنا چاہوں گا کہ "زادِ حرف" کے ذریعے میں نے خود کو پانے کا جو اِدراک حاصل کیا، وہ فقط یہ لفظ آپ کی نذر کر رہا ہوں، اِس یقین کے ساتھ کہ آپ صاحبِ بصارت بھی ہیں اور صاحبِ بصیرت بھی۔

اشرف نقوی

دسمبر دو ہزار چودہ

یہ کارِ عشق ہے، آتا ہے آتے آتے ہی
اور آ بھی جائے تو اکثر زباں سے آتا ہے

میں دیکھتا ہوں اُسی کا بھرا ہوا دامن
جو خالی ہاتھ تری آستاں سے آتا ہے

عالمِ بے کنار تجھ سے ہے
لفظِ کُن کی پکار تجھ سے ہے

عکس ، آنکھ اور آئینے تیرے
یعنی ہر جلوہ زار تجھ سے ہے

ذکر تیرا ہی باعثِ تسکین
وحشتوں میں قرار تجھ سے ہے

چاند سورج میں نور ہے تیرا
گُل کدے میں بہار تجھ سے ہے

تُو ہی فخر و غرور ہے میرا
میرا سارا وقار تجھ سے ہے

میرا ہونا اِس عالمِ کُن میں
باعثِ افتخار تجھ سے ہے

میری خوشیوں میں رونقیں تجھ سے
میرا غم پُر بہار تجھ سے ہے

تجھ سے بے اختیاریاں میری
اور ہر اختیار تجھ سے ہے

میری دنیا اور آخرت میری
میرے پروردگار تجھ سے ہے

تو نہ چاہے تو کچھ نہیں اشرفؔ
یہ تو بس ذی وقار تجھ سے ہے

یونہی جو آپؐ رہیں مجھ پہ مہرباں آقاؐ
تو کوئی غم مرے دل میں رہے کہاں آقاؐ

ہے آپؐ ہی کا کرم، آپؐ کی عنایت ہے
میں بے نشان ہوا صاحبِ نشاں آقاؐ

بس ایک بار مجھے اِذنِ حاضری بخشیں
نہ میری زیست چلی جائے رائیگاں آقاؐ

کچھ اس طرح میں قدم بوسی کا شرف پاؤں
کہ خاکِ طیبہ میں مل جائیں جسم و جاں آقاؐ

تمہارا عشق اگر میرا حرزِ جاں ٹھہرے
مرا بھی ذکر رہے زیبِ داستاں آقاؐ

میں کم نصیب نہیں ہوں ، نصیب والا ہوں
ہے مجھ پہ آپ کی رحمت کا سائباں آقاؐ

تمہاری یاد میں جو اشک آنکھ سے نکلیں
سلام اُن کو کرے کیوں نہ کہکشاں آقا

ستانے والوں کو ہر پل دعائیں دیتی ہے
بہت حلیم و کریم آپ کی زباں آقاؐ

اجاڑ دشت کی صورت تھی ذات اشرف کی
تمہی نے اِس کو بنایا ہے گلستاں آقاؐ

یوں بھی آنکھوں کو نم کیا جائے
آلِ احمدؐ کا غم کیا جائے

جوڑی جائے حسینؑ سے نسبت
ربطِ دنیا سے کم کیا جائے

کر کے روشن دیئے مودّت کے
دل کو طاقِ حرم کیا جائے

میں ہوں بیمار، پڑھ کے نادِ علیؑ
مجھ پہ اِک بار دم کیا جائے

حق تو یہ ہے کہ نوکِ نیزہ پر
سر کو حق کا علم کیا جائے

ایک سجدہ حسینی سنت میں
چاہے پھر سر قلم کیا جائے

میری ہر وہ خوشی ابد آثار
جس میں غم اُن کا ضم کیا جائے

بن کے آہوئے اہلِ بیت اشرف
دشتِ کربل میں رم کیا جائے

مکّے سے چل پڑا ہے جو مہمانِ کربلا
وا ہونے کو خوشی سے ہے دامانِ کربلا

اسلام کا چراغ بجھے گا نہ تا ابد
خون اِس کو دے گئے ہیں شہیدانِ کربلا

اِک سر جو سر بلند بھی اور ارجمند بھی
دیکھو ہے رہنمائے اسیرانِ کربلا

ہائے وہ جلتے خیمے، وہ بچے، وہ بیبیاں
ہائے وہ وقتِ شامِ غریبانِ کربلا

آ جایئے مدد کو ہماری بھی یا حسینؑ
ہم پر ستم کناں ہیں یزیدانِ کربلا

یہ بھی مرے حسینؑ کا فیضان ہی تو ہے
رشکِ فلک بنا ہے بیابانِ کربلا

مالک! مرے وطن کی ضرورت حسینؑ ہے
یہ ملک بنتا جائے ہے میدانِ کربلا

اشرف مرے خیال کا مرکز حسینؑ ہے
محور ہے میری سوچ کا سلطانِ کربلا

سُوکھے ہوئے دریا کی نشانی کے علاوہ
سب کچھ ہے مری آنکھ میں پانی کے علاوہ

آیا ہوں بھرے شہر سے اِک دشت کی جانب
اِک ہجر لیے نقل مکانی کے علاوہ

چوپال میں اے دیر سے بیٹھے ہوئے لوگو
کیا تم کو سناؤں میں کہانی کے علاوہ

کرنی ہے لہو سے مجھے آرائشِ مقتل
اور میرا لہو کچھ نہیں پانی کے علاوہ

تاثیر نہیں لہجے میں میرے، کہ زباں میں
لکنت بھی ہے آزردہ بیانی کے علاوہ

دریا ہوں سو بہتا ہی چلا جاؤں گا اشرف
سیکھا نہیں کچھ میں نے روانی کے علاوہ

خواہشِ وصل کو صورت وہ عطا کر دی ہے
ہجر پائندہ رہے، ہم نے دعا کر دی ہے

آئینہ خانے پہ چڑھ دوڑے ہو پتھر لے کر
آئینوں نے کہو کیا ایسی خطا کر دی ہے

خاک زادہ ہوں، سو قسمت نے گواہی میری
ایک عالم میں مری خاک اُڑا کر دی ہے

دشت لکھتا ہوں تو دریا ہی لکھا جاتا ہے
پیاس نے مجھ میں وہ ہلچل سی بپا کر دی ہے

فاصلہ دل کا تھا دہلیز سے دو چار قدم
میں نے رستے میں مگر عمر فنا کر دی ہے

رات کیا میں نے درِ خواب پہ دستک دے دی
ہائے آنکھوں نے مری نیند قضا کر دی ہے

ماورا ہونے لگا جسم کی حد سے اشرفؔ
جس نے اُس ذات میں گم اپنی انا کر دی ہے

خاک اور خاکدان سے باہر
میں رہا دو جہان سے باہر

مجھ میں اُس وقت دل دھڑکتا تھا
میں تھا جب جسم و جان سے باہر

آرزوئے نمو میں نکلا ہوں
جسم کے خاک دان سے باہر

ملنے والا ہے اک ٹھکانہ مجھے
ہر زمان و مکان سے باہر

اِک ستارہ رہا ہے پاس مرے
رات بھر آسمان سے باہر

داستاں گو نے مجھ کو رکھا ہے
میری ہی داستان سے باہر

ہیں قدم در قدم نشاں اُس کے
اور وہ ہر نشان سے باہر

مجھ کو رکھا ہے آئینہ گر نے
آئینوں کی دکان سے باہر

گُم اُسی کے ہوں عشق میں اشرفؔ
وہ جو رہتا ہے دھیان سے باہر

اِتنا رویا جا سکتا ہے
شہر ڈبویا جا سکتا ہے

قطرہ قطرہ آنکھ میں بھر کر
دریا ڈھویا جا سکتا ہے

یونہی روتے روتے اِک دن
دشت بھگویا جا سکتا ہے

اپنی ذات میں پا کر اُس کو
خود کو کھویا جا سکتا ہے

دکھ سکھ کے سب موتی چُن کر
ہار پرویا جا سکتا ہے

ایک ندامت کے آنسو سے
تن من دھویا جا سکتا ہے

جاگتی آنکھوں میں بھی اشرفؔ
خواب سمویا جا سکتا ہے

درِ اِمکاں جو وا کیا میں نے
خود کو بے اِنتہا کیا میں نے

عشق نے جب خراج مانگا تو
ہجر کا فیصلہ کیا میں نے

اِس قدر آئینوں کا ساتھ دیا
پتھروں کو خفا کیا میں نے

شام آئی تو ڈھلتے سورج کو
جلتا بجھتا دیا کیا میں نے

ہو گیا وادیٔ خیال میں گم
اور چُپ کو صدا کیا میں نے

کاغذی پھول اور پتّوں سے
گھر کو آراستہ کیا میں نے

جیسے ہوتی ہے جاں بدن سے الگ
خود سے تجھ کو جُدا کیا میں نے

مُختصر عالمِ کُن فکاں معذرت
میں سماؤں گا تجھ میں کہاں، معذرت

روشنی کی کِرن ماند پڑنے لگی
عشق آخر ہوا رائیگاں، معذرت

خاک سے خاک ملنے کو بے تاب ہے
اب نہ کرنا مِرے خاکداں معذرت

میں بھی تھک سا گیا، تم بھی سونے لگے
پوری ہو نہ سکی داستاں، معذرت

یاد رکھنا تمہیں اب تو ممکن نہیں
میری جانب سے اے رفتگاں معذرت

جس قبیلے کی آنکھوں کا تارا ہوں میں
اُس کی آنکھوں سے بھی ہے عیاں معذرت

ہم بھی گُم ہیں کہیں، تُم بھی گُم ہو کہیں
بھر گیا منظروں میں دُھواں معذرت

اُس طرف تھی ضرورت، اِدھر عشق تھا
اور دونوں کے تھی درمیاں معذرت

میں نے بعد از دعا جب اُٹھائی نظر
لکھا دیکھا سرِ آسماں معذرت

تم سے میرا بھی اہلِ یقیں اعتذار
میری تم سے بھی اہلِ گماں معذرت

تیرے لفظوں میں اشرفؔ ہے بوئے خزاں
کس کو بھائے گا تیرا بیاں، معذرت

آئینہ عکس پہ حیران کہاں تھا پہلے
میرے جیسا کوئی انسان کہاں تھا پہلے

یہ تو اب آ کے تجھے جانا ہے میں نے، ورنہ
تیرے ہونے کا بھی اِمکان کہاں تھا پہلے

دُکھ ہے اِس کو بھی کوئی میرے ہی جیسا شاید
دشت میری طرح ویران کہاں تھا پہلے

ہجر نے ہی تو مجھے وصل کی آسانی دی
قُرب ورنہ ترا آسان کہاں تھا پہلے

ساتھ میرے تری یادوں کی مہک رہتی تھی
میں گلستاں تھا ، بیابان کہاں تھا پہلے

یہ تو بس عشق مجھے اِس کی طرف لایا ہے
شعر ورنہ مرا میدان کہاں تھا پہلے

وہ جو مصروف ہے اب کارِ جہاں میں اشرفؔ
میری حالت سے وہ انجان کہاں تھا پہلے

چھنکے نہ اگر پاؤں میں زنجیر ہماری
لازم ہے بڑھے دار پہ توقیر ہماری

ہم خواب کے مجرم، کبھی تعبیر کے مجرم
تجویز کرے نیند ہی تعزیر ہماری

بیداریٔ شب کا بھی ہمیں کوئی صِلہ دے
تقدیر بنا نالۂ شب گیر ہماری

ہر ایک زمانے میں چلے جاتے تھے بے خوف
جب وقت ہوا کرتا تھا جاگیر ہماری

وہ لوح بھی لگتا ہے کہ پانی سے بنی تھی
جس لوح پہ لکھی گئی تقدیر ہماری

ہم دیکھا کیے ایک طرف ہو کے تماشا
نجات سے اُلجھتی رہی تاخیر ہماری

کچھ ایسے ہیں ہم نورِ محبت سے منور
پہنچی ہے چراغوں میں بھی تنویر ہماری

یوں آئے ہیں ہم عالمِ امکان میں اشرفؔ
تصویرِ زماں بن گئی تصویر ہماری

اِک خواب داں میں خواب سجا کر میں سو گیا
جب نیند آئی ، جسم بچھا کر میں سو گیا

باہر بدن سے تھا تو بہت جاگتا تھا میں
آتا ہوا بدن میں تو آ کر میں سو گیا

دریا بڑھا تھا میری طرف طمطراق سے
اِک دشت تھا ، سو پیاس بجھا کر میں سو گیا

پہلے سُنا چراغ و ہوا کا مکالمہ
پھر داستان اپنی سُنا کر میں سو گیا

پوچھا کسی نے مجھ سے جو انجامِ زندگی
جلتا ہوا چراغ بجھا کر میں سو گیا

شب بھر کیا کشیدہ سحر کی اُمید کو
حجرے میں صبح ہوتے ہی جا کر میں سو گیا

گر یہ تلوار گر گئی میری
سمجھو دستار گر گئی میری

میں ہوں اِک بے اَمان گھر کی طرح
جب سے دیوار گر گئی میری

اب ہوا بھی کلام کرتی نہیں
اِتنی گفتار گر گئی میری

رہبروں نے وہ رہنمائی کی
سطحِ کردار گر گئی میری

۵۰

میری زنجیر مجھ سے آگے تھی
پھر بھی رفتار گِر گئی میری

جوں ہی ٹوٹا مِری اَنا کا حِصار
خشتِ اِنکار گِر گئی میری

منزل کی طلب راہ کی دیوار ہوئی ہے
زنجیر مرے پاؤں میں آزار ہوئی ہے

کم ہونے نہیں دیتا مری پیاس کی شدت
دریا سے مری دوستی بے کار ہوئی ہے

یہ داغ جو پیشانی کا لو دینے لگا ہے
پیشانی مری مطلعِ انوار ہوئی ہے

مجھ سے ہیں خفا دونوں ہی، سایہ بھی شجر بھی
بس دھوپ اماں دینے پہ تیار ہوئی ہے

پہلے تو ہمیں مارا گیا دشت میں لا کر
اور بعد میں اِک خلق عزا دار ہوئی ہے

جب میں ہی چلا آیا ہوں منظر سے نکل کر
تب شام مری طالبِ دیدار ہوئی ہے

یہ وقت کہیں پیچھے ہی رہ جائے نہ اشرفؔ
اِس واسطے کچھ کم مری رفتار ہوئی ہے

سب زمانی اور مکانی مختلف
ہر کسی کی ہے کہانی مختلف

آنکھ اور دریا کا رشتہ منفرد
اور دونوں کی روانی مختلف

رایگاں ہوتے ہوئے اِس دور کی
ہو رہی ہے رایگانی مختلف

خاک کے مہمان ہو کر دیکھئے
خاک کی ہے میزبانی مختلف

گھر، گلی میں رابطہ دیوار ہے
درمیاں ہے در نشانی مختلف

آنکھ سے تارہ گرا ہے اور خاک
کر رہی ہے نوحہ خوانی مختلف

سن رہی ہے غور سے یہ کائنات
کہہ رہا ہوں اِک کہانی مختلف

میں کتابِ زیست کا عنوان ہوں
کیوں نہ ہوں میرے معانی مختلف

دے مرے احباب کو خوشیاں، مجھے
غم کی صورت شادمانی مختلف

یوں مرا ملکِ سخن میں نام ہو
شعرِ تر ہو آسمانی مختلف

عکس ہے یا آئینہ میرا وجود
میری اشرف گُن فکانی مختلف

بنا رہا ہے ستارے سے جو غبار مجھے
اُس آسماں سے زمیں پر ابھی اُتار مجھے

مَیں اپنے آپ سے باہر پڑا رہوں کب تک
جو ہو سکے تو مری خاک سے گزار مجھے

مری رہائی کا پروانہ رو کے جاری کر
کہ چشمِ تر میں کسی پل نہیں قرار مجھے

تمام دن مجھے دریا نے ساتھ ساتھ رکھا
ہوئی جو شام بھنور میں گیا اُتار مجھے

اگر جہاں میں کہیں بھی نہیں جگہ میری
تو کائنات سے باہر کرو شمار مجھے

تمام دن مجھے دریا نے ساتھ ساتھ رکھا
ہوئی جو شام بھنور میں گیا اُتار مجھے

سفر ازل سے ہے سیارگاں کے ساتھ مرا
سو کیسے چھوڑے گا اشرف مرا مدار مجھے

فنا ہوتے نہ کیوں آثار میرے
شکستہ تھے در و دیوار میرے

میں دریا ہوں ، ازل سے منتظر ہوں
کبھی وہ بھی تو اُترے پار میرے

مگن ہوں گرچہ خود کو جاننے میں
نہیں مجھ پر کھلے اسرار میرے

یہ دشتِ نجد ہے میرا ٹھکانہ
یہیں تم پاؤ گے آثار میرے

کہاں پر کھو گئی ہے دولتِ دل
کہاں ہیں دِرہم و دینار میرے

کبھی آنکھوں میں میری نیند بھر دو
کبھی سپنے کرو مسمار میرے

میں اپنی نیند تیرے نام کر دوں
مرے پہلو میں آ بیدار میرے

میں اِک صدیوں پرانا ثمر ہوں اشرف
مجھے بھولے ہیں موسیقار میرے

نہ آسماں ، نہ کسی کہکشاں سے آتا ہے
ہمارا رزق اِسی خاکداں سے آتا ہے

یہ کارِ عشق ہے ، آتا ہے آتے آتے ہی
اور آ بھی جائے تو اکثر زیاں سے آتا ہے

جو ہو نہ رشتہ زمیں سے زمین زادوں کا
بگاڑ کوئی کہیں درمیاں سے آتا ہے

مری ادھوری کہانی میں اِک کہانی کار
نکل کے روز کسی داستاں سے آتا ہے

میں دیکھتا ہوں اُسی کا بھرا ہوا دامن
جو خالی ہاتھ ترے آستاں سے آتا ہے

کہاں پہ جاتا ہے انسان بعد مرنے کے
جہاں میں آنے سے پہلے کہاں سے آتا ہے

جو گونجے آج بھی اشرفؔ صدائے کُن پھر سے
تو اِک جہانِ مکاں، لامکاں سے آتا ہے

جس جگہ پر ہے اب کھنڈر موجود
یہاں ہوتا تھا ایک گھر موجود

دے کے دستار سر بچایا تھا
اب نہ دستار ہے ، نہ سر موجود

تم کنارے پہ صبحِ روشن کے
میں کنارۂ شام پر موجود

تم ہی نکلے نہیں نظارے کو
میں فلک پر تھا رات بھر موجود

مجھ شرر کو ہمیشہ رہنا ہے
بجھتے جذبوں کی راکھ پر موجود

عالمِ کُن میں میں نہیں تھا مگر
میرے ہونے کی تھی خبر موجود

میں کسی شکل میں نہ ڈھل پایا
گو ازل سے ہوں چاک پر موجود

گھر تو سیلاب لے گیا اشرفؔ
اب نہ دیوار ہے ، نہ در موجود

جس دن سے خموشی ہوئی ہمراز ہماری
گم ہو گئی صحراؤں میں آواز ہماری

گرتا ہمیں پاتال میں تم دیکھ رہے ہو
دیکھی نہیں افلاک پہ پرواز ہماری

گم ہوتے گئے خواب کی وادی میں کہیں ہم
کو نیند بھی ہو پائی نہ آغاز ہماری

در اِس کا اگر وا ہو کسی اور جہاں میں
دیوار نہ ہو پھر نظر انداز ہماری

سوچا تھا کہ اِک دشت کو سیراب کریں گے
بے کار گئی ہائے تگ و تاز ہماری

آؤ کہ نئے عکس کی تنظیم کریں ہم
حیرت نہ رہے آئینہ پرداز ہماری

ہم وقت کے سرمد بھی ہیں، منصور بھی اشرفؔ
گونجے گی ہر اِک دور میں آواز ہماری

کنارِ خواب رُکے کارواں چلے گئے ہیں
مسافرانِ دل و جاں کہاں چلے گئے ہیں

زمین دیکھ رہی ہے سبھی کو حیرت سے
مکین بیٹھے ہوئے ہیں، مکاں چلے گئے ہیں

ہماری آنکھ کو جکڑا ہوا ہے حیرت نے
پہ منظروں سے ہمارے نشاں چلے گئے ہیں

مثالِ سنگ زمیں پر پڑا ہوا ہوں مگر
مرے ستارے سرِ آسماں چلے گئے ہیں

پرندے لَوٹ کے آئے ہیں اور پریشاں ہیں
ہوائے تیز کے سنگ آشیاں چلے گئے ہیں

جو لوگ مرکزی کردار تھے کہانی کے
نکل کے خود ہی پسِ داستاں چلے گئے ہیں

نہ اب ہے میرؔ سا رنگِ سخن ، نہ غالبؔ سا
کہ جب سے روٹھ کے اہلِ زباں چلے گئے ہیں

یہ زمیں ، وہ آسماں ہے اور میں
یعنی بزمِ کن فکاں ہے اور میں

رات بھی باقی ، دیا بھی بجھ گیا
نا مکمل داستاں ہے اور میں

دل سے سب مہمان رخصت ہو گئے
اب فقط خالی مکاں ہے اور میں

یعنی تینوں کی کوئی منزل نہیں
دل ہے ، بحرِ بے کراں ہے اور میں

بے تحاشہ بھاگتا ہوں رات بھر
شہر آوارہ سگاں ہے اور میں

دشت ہے ، دریا ہے اور فوجِ یزید
کربلائے بے اماں ہے اور میں

خشک دریا پیاس سے ہے جاں بہ لب
آنکھ میں اشکِ رواں ہے اور میں

اپنی اپنی منزلیں ، اپنے مدار
گردشِ سیارگاں ہے اور میں

شب کا پچھلا پہر ، خاموشی کا شور
دل ہے ، دردِ ناگہاں ہے اور میں

ہوئی جس روز سے آباد مجھ سے
زمیں پر آئی ہے اُفتاد مجھ سے

اندھیرے راستوں میں ڈھونڈتا ہوں
کسی کی کھو گئی ہے یاد مجھ سے

چراغوں کو بجھانا چاہتی تھی
ہوا نے کی طلب اِمداد مجھ سے

مری خاموشی اکثر بولتی ہے
یہی اِک شے ہوئی ایجاد مجھ سے

دیے نے بھی کنارہ کر لیا ہے
ستارہ بھی ہوا ناشاد مجھ سے

طلب گارِ زمانہ میں نہیں ہوں
زمانہ چاہتا ہے داد مجھ سے

مرے گھر میں اُتر کر چاند اشرفؔ
یہ کس کی کہہ گیا روداد مجھ سے

کہیں زمیں ، کہیں آسماں سے باہر ہے
میاں ! یہ عشق زمان و مکاں سے باہر ہے

مجھے نہ ڈھونڈ کہ میں تیری دسترس میں نہیں
مرا وجود تو نام و نشاں سے باہر ہے

مجھے خبر ہے کہ ہوتا ہے کیا فراق کا دُکھ
میں وہ ستارہ ہوں جو کہکشاں سے باہر ہے

جو غم ملا تھا وہ غم بھی تھا ضبط سے باہر
خوشی ملی ہے تو یہ بھی بیاں سے باہر ہے

تم اپنا قافلہ سالار چُن رہے ہو اُسے
وہ جس کا سارا سفر کارواں سے باہر ہے

کبھی پلٹ کے نہ آئے گا تیر کی صورت
وہ اِک سخن جو ہماری زباں سے باہر ہے

وہی وسیلہ ہے تکمیلِ ذات کا اشرفؔ
جو ایک شخص صفِ دوستاں سے باہر ہے

ٹوٹا ہے جب سے کوئی ستارہ زمین پر
کچھ بھی نہیں بچا ہے ہمارا زمین پر

گرچہ ملائکہ نے فسادی بشر کہا
پھر بھی مجھے خدا نے اُتارا زمین پر

میرے علاوہ کوئی اِسے تھامتا نہ تھا
میں نے دیا فلک کو سہارا زمین پر

جنت سے کھینچ لائی زمیں کی کشش ہمیں
یا منتظر تھا کوئی ہمارا زمین پر

مولا ! مثالِ عیسیٰ سرِ آسماں اُٹھا
ہونے لگا ہے اب تو خسارہ زمین پر

مالک ! ترے جہاں میں اگر کچھ کمی نہیں
پھر کیوں نہیں ہے کچھ بھی ہمارا زمین پر

کچھ شکل بن رہی تھی سرِ چاک جب مری
مجھ کو کسی نے کھینچ کے مارا زمین پر

اشرفؔ ہمیں وہ شخص ابھی تک نہیں ملا
آئے تھے جس کا کرنے نظارا زمین پر

کسی کی یاد سہارا شبِ فراق کا ہے
دل ایک ٹوٹا ستارہ شبِ فراق کا ہے

ہے کیا مجال ، یہاں اہلِ وصل آ جائیں
یہ دشت سارے کا سارا شبِ فراق کا ہے

جو ایک بار ہوا غرق ، پھر نہیں اُبھرا
کچھ ایسا گہرا کنارا شبِ فراق کا ہے

جہاں بھی جایئے ، یہ ساتھ ساتھ رہتی ہے
جہاں بھی دیکھو اجارہ شبِ فراق کا ہے

نہ نیند آئی ہمیں اور نہ تم ہی سو پائے
یہ جاگنا بھی ہمارا شبِ فراق کا ہے

خیالِ یار کے اشرفؔ چراغ روشن کر
مجھے یہ بھی اِشارہ شبِ فراق کا ہے

یہ جو آنکھوں میں نم ادھورا ہے
سچ تو یہ ہے کہ غم ادھورا ہے

زندگی زندگی نہیں لگتی
آ رہا ہے جو دم ادھورا ہے

اے خدا! پھر سے اِک صدائے کُن
میرا ہر زیر و بم ادھورا ہے

زیست میں ہے کوئی ادھورا پن
ہے بہت ، پھر بھی کم ادھورا ہے

منزلوں کا سراغ پانے تک
آپ کا ہر قدم ادھورا ہے

عشق اشرفؔ نہ گر کسی سے ہو
دشتِ وحشت میں رم ادھورا ہے

خواب دیکھے بِنا تعبیر سے بندھ کر بیٹھا
میں کہ موہوم سی زنجیر سے بندھ کر بیٹھا

مجھ کو دیکھا گیا اِس شہر میں حیرانی سے
جلدبازوں میں جو تاخیر سے بندھ کر بیٹھا

وہ بھی مامور مری ذات کی مسماری پر
میں بھی اِک حسرتِ تعمیر سے بندھ کر بیٹھا

ایسے مبہوت ہوا جیسے کہ بُت پتھر کا
مُدتوں میں تری تصویر سے بندھ کر بیٹھا

میں رہا محو اُسی دل کی پذیرائی میں
جو کسی زلفِ گرہ گیر سے بندھ کر بیٹھا

وقت سے کہہ دو کہ نا وقت میں تبدیل نہ ہو
میں ابھی کسی کی ہوں تقدیر سے بندھ کر بیٹھا

اب بھی کرتا نہیں تدبیرِ رہائی کوئی
طائرِ جاں ہے کہ تقدیر سے بندھ کر بیٹھا

جانے کیا بات ہے اِس شہرِ سخن میں اشرف
لفظ در لفظ ہوں تحریر سے بندھ کر بیٹھا

ہر سُو جو پانیوں کا اجارہ ہے اِن دِنوں
ناراض اِک ندی سے کنارہ ہے اِن دِنوں

کوئی بھی عکس باعثِ حیرت نہیں رہا
گردش میں آئینوں کا ستارہ ہے اِن دِنوں

یہ وقت جیسے کوئی عمارت گری ہوئی
اور اِس پہ خود کو میں نے اُسارا ہے اِن دِنوں

یہ زیست میرے پاس امانت کسی کی ہے
ہر غم کا ورنہ موت ہی چارہ ہے اِن دِنوں

مہنگی پڑے گی تجھ کو چراغوں سے دوستی
مجھ کو یہی ہوا کا اشارہ ہے اِن دِنوں

گم ہو کے رہ گیا ہوں میں راہوں میں ہی کہیں
کن منزلوں نے مجھ کو پکارا ہے اِن دِنوں

وحشت میں ہم کو گھر سے نکلنا نہیں پڑا
گھر بھی تو مثلِ دشت ہمارا ہے اِن دِنوں

اشرفؔ اُسی نے مجھ کو مکمل نہیں کیا
جس دستِ کوزہ گر پہ گزارہ ہے اِن دِنوں

ہم جو اَب جسم میں نہ جان میں ہیں
کون جانے کہ کس جہان میں ہیں

اب کہیں بھی ہمارا ذکر نہیں
ہم سمجھتے تھے داستان میں ہیں

کر گئے پار وقت کی حد کو
ہم زمیں پر نہ آسمان میں ہیں

اور کوئی ہمارے بیچ نہیں
ہم ہی بس اپنے درمیان میں ہیں

ہے ہواؤں کا سامنا ہم کو
ہم چراغوں کے خاندان میں ہیں

منکشف خود پہ ہو گئے وہ لوگ
رات دن گم جو تیرے دھیان میں ہیں

ایک بھی لفظ میں مٹھاس نہیں
اِس قدر تلخیاں زبان میں ہیں

ریت اشرفؔ بھری ہے نس نس میں
دشت کے دشت جسم و جان میں ہیں

اِک اِسمِ خاص کی یہ پڑھائی کا وقت ہے
سب مل کے دیں صدائیں، دُہائی کا وقت ہے

دھو ڈالیے اب اشکوں سے ساری زمینِ دل
یہ ہی تو اِس حرم کی صفائی کا وقت ہے

ہم یونہی رات کو تو نہیں جاگتے میاں!
ہم اہلِ حرف کی یہ کمائی کا وقت ہے

بجھتا ہوا چراغ ہوں صُبحِ فراق کا
کچھ پل ہی میری جلوہ نمائی کا وقت ہے

اے اہلِ شوق! نکلو گھروں سے، یہ وقت تو
دشتِ جنوں میں آبلہ پائی کا وقت ہے

اے چشمِ خواب ناز حقیقت میں ڈھل ابھی
کچھ لمحے تیری مدح سرائی کا وقت ہے

اشرفؔ مرے لیے تو قیامت کی ہے گھڑی
یہ وقت، جو کسی سے جدائی کا وقت ہے

ہیں ایسے تاج سروں پر کہ سر خمیدہ ہیں
ہمیں ملی وہ خوشی ، پیرہن دریدہ ہیں

کیا فرشتوں نے سجدہ بروزِ صبحِ ازل
تمہیں خبر ہے کہ ہم کتنے برگزیدہ ہیں

ہمارے لب پہ ہنسی ہے ، یہی غنیمت ہے
وگرنہ لوگ تو رنجور ہیں ، کبیدہ ہیں

ہمیں نے دینِ محبت جہاں میں پھیلایا
ہمیں پہ تہمتِ یاراں کہ بے عقیدہ ہیں

سہا وہ ظلم کہ اب کچھ پتا نہیں چلتا
ہمارے ہاتھ قلم ہیں کہ سر بُریدہ ہیں

اگر نہ غم ہو کوئی، تب بھی روتی رہتی ہیں
ہماری آنکھیں ازل سے ہی آبدیدہ ہیں

نہیں ہے اُس کی سخاوت میں کچھ کمی اشرفؔ
ہمارے اپنے ہی دامن بہت دریدہ ہیں

بہت بے باک ہوتا جا رہا ہے
یہ دل سفاک ہوتا جا رہا ہے

محبت عشق میں ڈھلنے لگی ہے
گریباں چاک ہوتا جا رہا ہے

میں خود سے بے خبر رہنے لگا ہوں
مجھے ادراک ہوتا جا رہا ہے

مری ہستی کا ہے اِتنا حوالہ
ستارہ خاک ہوتا جا رہا ہے

نمو کی آرزو میں دل کا پودا
خس و خاشاک ہوتا جا رہا ہے

نہیں پانی اگر آنکھوں میں اشرفؔ
یہ کیا نمناک ہوتا جا رہا ہے

یہ جانتا ہوں کہ نازک ہے آبگینے سے
سو اُس کو دل میں رکھا ہے بہت قرینے سے

تجھے خبر ہے؟ ترے ہجر ہی کا حصہ ہیں
جو درد لپٹے ہوئے ہیں ہمارے سینے سے

بلایا اِتنے تسلسل سے اہلِ کوفہ نے
مجھے نکلنا پڑا آخرش مدینے سے

نہیں ہے دل میں کسی آرزو کی گنجائش
بھرا ہوا ہے تری یاد کے خزینے سے

بھنور کی زد میں جو دیکھو تو یہ سمجھ لینا
لپٹ کے رونا ہے دریا مرے سفینے سے

کسی کی یاد میں کھویا ہوں اِس طرح اشرفؔ
نہیں ہے اپنی خبر بھی کئی مہینے سے

زیست بسر یوں کرتا ہوں
شام سویرے مرتا ہوں

دشت کی پیاس بجھانے کو
آنکھ میں پانی بھرتا ہوں

ناؤ میں کاغذ کی ہر روز
دریا پار اُترتا ہوں

روز ہتھیلی پہ اپنی
جلتا سورج دھرتا ہوں

پھر وہ آنکھ میں اُترا ہے
میں جس خواب سے ڈرتا ہوں

جس سے ہوں انجان اشرفؔ
یاد اُسے ہی کرتا ہوں

لفظ تاثیر سے الگ رکھا
شعر جو میر سے الگ رکھا

تیرے چرچے کیے جہاں بھر میں
خود کو تشہیر سے الگ رکھا

آیتِ حُسن کی تلاوت کو
حُسنِ تفسیر سے الگ رکھا

جب بھی چاہا مکالمہ کرنا
تجھ کو تصویر سے الگ رکھا

ہم نے مال و متاعِ دُنیا کو
دل کی جاگیر سے الگ رکھا

کیوں تجھے کاتبِ مقدر نے
میری تقدیر سے الگ رکھا

مجھ کو باندھا کسی نے حیرت سے
اور زنجیر سے الگ رکھا

قصرِ خواب و خیال کو ہم نے
حُسنِ تعمیر سے الگ رکھا

سارے عالم کی غم گساری کو
غمِ شبیرؑ سے الگ رکھا

اُس دن میں تپتی دھوپ سے بیزار کچھ ہوا
جب میرے حق میں سایۂ دیوار کچھ ہوا

یوسف تو میں نہیں تھا، پہ بازارِ مصر میں
مائل مری طرف بھی خریدار کچھ ہوا

دیکھا گیا نہیں تجھے ظاہر کی آنکھ سے
باطن پہ منکشف ترا اسرار کچھ ہوا

وہ درد ہے کہ آنکھ میں اُگنے لگے ہیں اشک
اِس کھیت سے بھی چلیے نمودار کچھ ہوا

کچھ دل میں درد اور ہے آنکھوں میں کچھ نمی
صد شکر غم کا پیڑ ثمر بار کچھ ہوا

انصاف چاہتے تھے ہر طاق کچھ چراغ
مُنصف مگر ہوا کا طرف دار کچھ ہوا

جس روز چھوڑ دی اُسے پانے کی آرزو
اُس روز میرے حق میں وہ ہموار کچھ ہوا

گُم ہو گئی وہ راہ کسی دشتِ خواب میں
جس راہ پہ میں چلنے کو تیار کچھ ہوا

اُکتا گیا ہے مجھ سے بھی اشرفؔ مرا وجود
مجھ کو بدن جو باعثِ آزار کچھ ہوا

وقت نے پائمال کر ڈالا
مجھ کو خواب و خیال کر ڈالا

اِک دیے نے کمال کرتے ہوئے
تیرگی کو نڈھال کر ڈالا

ہم عجب طرز کے بھکاری ہیں
مفلسوں سے سوال کر ڈالا

گر نہ جائے ، سو میری جھولی میں
اُس نے غم بھی سنبھال کر ڈالا

میرے ہونے نے تیرا ہر منظر
منظرِ پُر جمال کر ڈالا

تُو وہی ہے نا دوست! جس نے مجھے
وقفِ شامِ ملال کر ڈالا

ہم نے رو رو کے آنکھ کا موسم
موسمِ برشگال کر ڈالا

کاسۂ دل میں اُس نے سکۂ عشق
جب بھی ڈالا ، اُچھال کر ڈالا

آرزوئے حیات نے اشرفؔ
میرا جینا محال کر ڈالا

میانِ فتح و شکستِ اَنا سلامت ہے
ہمار عشق ، ہماری وفا سلامت ہے

ملے گی کوئی زُلیخا تو دیکھا جائے گا
ابھی تلک تو ہماری قبا سلامت ہے

کبھی بکھر نہیں سکتا میں یاس کے ہاتھوں
مرے لبوں پہ ابھی تک دُعا سلامت ہے

شبیہِ وقت بنانے کو کچے رنگوں سے
مرا ہُنر ، مری فکرِ رسا سلامت ہے

ترے کرم نے بچایا مجھے حوادث سے
وگرنہ شہرِ نگاراں میں کیا سلامت ہے

نہ رہ سکوں گا روایت سے ٹوٹ کر زندہ
کہ میرے خوں میں زمیں سے وفا سلامت ہے

رہِ سخن میں نئی منزلیں دِکھانے کو
یہ میرا دل، یہ مرا رہنما سلامت ہے

لمحہ لمحہ گزارتی ہے مجھے
زندگی یوں بھی مارتی ہے مجھے

دُور خود سے مَیں جب بھی ہوتا ہوں
میری مٹی پکارتی ہے مجھے

عکس ہوں میں ، تُو میرا آئینہ
تیری حیرت سنوارتی ہے مجھے

شب تنہائی اور یاد تری
اِک غزل پر اُبھارتی ہے مجھے

ہجرت و ہجر کی فراوانی
زندہ رکھتی نہ مارتی ہے مجھے

رنج ہوتا ہے ناؤ کو اشرفؔ
جب بھنور میں اُتارتی ہے مجھے

وحشت سی بھر گئی ہے دلِ زار میں میاں
ہم خوش ہیں پھر بھی عشق کے آزار میں میاں

سورج کے سامنے تو نہیں کوئی شے مگر
چمکیں گے ہم ضرور شبِ تار میں میاں

کوئی بھی مشتری نہیں یاں دل کے مال کا
کیا بیچنے کو لائے ہو بازار میں میاں

بکنے تو آ گئے ہو مگر یہ بھی سوچ لو
تابِ خرید بھی ہے خریدار میں میاں

ہم لوگ ٹہنیوں سے ہیں ٹوٹے ہوئے گلاب
اب کام کیا ہمارا چمن زار میں میاں

دیوار گر رہی ہے تو کچھ آسرا بھی دو
گر بیٹھنا ہے سایۂ دیوار میں میاں

اشرفؔ ہمارے نام نے ہم کو شرف دیا
تاثیرِ گُل کی ورنہ کہاں خار میں میاں

خوشی کو چھوڑ کے آزار کی طرف آیا
میں ایک دشت سے گھر بار کی طرف آیا

مجھے خبر ہے کہ قیمت نہیں کوئی میری
مگر میں پھر بھی خریدار کی طرف آیا

یہ چار روزہ جو میلہ یہاں لگا ہوا ہے
دل اِس کو دیکھنے بازار کی طرف آیا

مرے خدا نے مجھے ایسی سر بلندی دی
میں نوکِ نیزہ پہ دربار کی طرف آیا

خدا کا شکر کہ میں بھی حُسینؑ سُنّت میں
یزیدِ وقت کے انکار کی طرف آیا

پلٹ کے لوٹ گیا میرے دُشمنوں کی طرف
وہ حرف جو مِرے کردار کی طرف آیا

اُسے بھی گھیرا ہوا ہے ہواؤں نے اشرؔف
جو اِک چراغ شبِ تار کی طرف آیا

اِس طرح عازمِ سفر تھا میں
بھول کر راہ ، راہ پر تھا میں

ایک عالم سے با خبر رہ کر
اپنی حالت سے بے خبر تھا میں

میں نہیں تھا جب عالمِ کُن میں
تب بھی منظر میں جلوہ گر تھا میں

کہہ رہے ہیں بُریدہ ہاتھ مرے
ہاں ، کبھی صاحبِ ہُنر تھا میں

کچھ نہیں تھا مرا حوالہ مگر
یار لوگوں میں معتبر تھا میں

بے اماں دشت کی مسافت میں
چھاؤں دیتا ہوا شجر تھا میں

رو رہا تھا میں خشک آنکھوں سے
اور اشکوں سے تر بتر تھا میں

تھا مرا شہر میں ہی گھر اشرؔف
پر کہیں اور در بدر تھا میں

کم ہے کچھ یا بہت زیادہ ہے
تو ہی لیکن مرا اِرادہ ہے

ایک پہلو میں دن کھڑا ہے مرے
ایک میں شام ایستادہ ہے

سب کے رازوں کو ڈھانپ لیتی ہے
شب کا دامن بہت کشادہ ہے

آسمانوں پہ اُڑ رہا ہے جو
وہ پرندہ زمیں زادہ ہے

دُور آفاق سے مِری منزل
اور خلائے بسیط جادہ ہے

ایک دُوجے کو ڈھانپتے ہیں ہم
میں تِرا ، تو مِرا لبادہ ہے

رنج شعروں میں ڈھالنا اشرفؔ
میر صاحب سے استفادہ ہے

اُلجھے ہوئے لفظوں کے معانی کی طرح ہوں
میں شہرِ حقیقت میں کہانی کی طرح ہوں

اُتری ہے کوئی شام مضافاتِ بدن میں
دو چار گھڑی لمحۂ فانی کی طرح ہوں

دریا میں بہاؤ ہے مرا آب کی صورت
صحرا میں سرابوں کی روانی کی طرح ہوں

تجھ کو بھی کوئی کام نہیں حُسنِ عمل سے
اور میں بھی تری شعلہ بیانی کی طرح ہوں

سمٹا ہوا رہتا ہوں صدا ذات میں اپنی
خوشبو میں مگر رات کی رانی کی طرح ہوں

اشرفؔ ہوں کسی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو
نمکین کسی بحر کے پانی کی طرح ہوں

آبِ رواں پہ کہہ کو کہ ہیں مثلِ حباب ہم
رکھے ہوئے ہیں آنکھ میں صدیوں کے خولب ہم

شاید کہ جاگتے میں مکمل کریں اسے
تعمیر کر رہے ہیں جو دیوارِ خواب ہم

نیزے پہ سر ہے اور بدن تپتی ریت پر
مقتل سے ہو کے نکلے ہیں عزت مآب ہم

بنجر تمہارے دل کی زمیں ہے تو کیا ہوا
اِس دشت میں اُگاتے رہیں گے گلاب ہم

خود کو تو اب تلک بھی میسّر نہیں ہوئے
تجھ کو زمانے ہوں گے کہاں دستیاب ہم

جب میں چلا تو چاند بھی ہمراہ چل پڑا
اِک دوسرے کے ہو کے چلے ہمرکاب ہم

قیدی ہیں ہم بدن کے سو مٹی کی قید سے
کروا رہے ہیں خود کو ابھی بازیاب ہم

اشرفؔ بہت خیال تھا ہم کو چراغ کا
گھر میں تبھی تو لائے نہیں آفتاب ہم

جو استعارے سے آگے نکل گیا ہوتا
دیا ستارے سے آگے نکل گیا ہوتا

جو میری سورۂ والعصر پر نظر ہوتی
میں ہر خسارے سے آگے نکل گیا ہوتا

مجھے سمیٹے رکھا میرے ضبط نے، ورنہ
میں ہر کنارے سے آگے نکل گیا ہوتا

تمہارا خواب نہ گر پاؤں سے لپٹ جاتا
میں اِس نظارے سے آگے نکل گیا ہوتا

اشکوں سے بیاں کوئی کہانی نہیں کرتے
ہم آنکھ کے پانی کو بھی پانی نہیں کرتے

لکھ لیتے ہیں ہر لفظ کو ہم آبِ رواں پر
سودائے دل و جان زبانی نہیں کرتے

پھولوں کی طرح رکھتے ہیں گفتار کا لہجہ
ہم جنگ میں بھی شعلہ بیانی نہیں کرتے

عشق گر دستیاب ہو جائے
ہر دُعا مُستجاب ہو جائے

جب میں سورج کے رُخ پہ ہاتھ رکھوں
اُس کی کم آب و تاب ہو جائے

ختم لیکن کتابِ عشق نہ ہو
ختم سارا نصاب ہو جائے

طاق میں اِس لیے ہے دل رکھا
ہر دِیا فیض یاب ہو جائے

میری مٹی کو اے خدا ! حاصل
نسبتِ بُو تُرابؑ ہو جائے

جب سے مہکا وہ میرے آنگن میں
گھر بدلنے لگا ہے گلشن میں

میری پہچان میں نہیں آتا
عکس ٹھہرا ہے کس کا درپن میں

دھوپ دیوار سے اُترتے ہوئے
آ رکی آج میرے آنگن میں

یہ چراغوں کا فیض ہے شاید
روشنی بھر گئی ہے تن من میں

اپنے بچوں کے رُوپ میں اشرفؔ
لوٹ آیا ہوں اپنے بچپن میں

کہیں سے خشک، کہیں پر بہت سا پانی ہے
مِری زمین کی رنگت بھی آسمانی ہے

میں اِس لیے بھی گلابوں کی بات کرتا ہوں
کہ پھول کوئی بھی ہو پیار کی نشانی ہے

ہماری آنکھوں کے سوتے کبھی کے خشک ہوئے
بجائے اشک، یہاں ریت کی روانی ہے

وہ میری خاک سے پیکر نیا بنائے گا
کہ اُس کو توڑ کے ہر شے نئی بنانی ہے

کوئی چراغ جلے تو یہاں جلے کیسے
کہ اِس نگر پہ ہواؤں کی حکمرانی ہے

گھروں کی طرح سے تقسیم ہو گئے ہیں دل
بطورِ رسم ہی دیوار اب اُٹھانی ہے

ہماری آنکھ کبھی خواب آشنا ہوئی تھی
یہ رت جگا بھی اُسی خواب کی نشانی ہے

کمال کیسا مصنف نے کر دیا اشرفؔ
مرے بغیر مکمل مری کہانی ہے

غبارِ وقت کو چہرے پہ مل رہا ہوں میں
کہ دن ہوں اور کسی شب میں ڈھل رہا ہوں میں

رُکی ہوئی ہے کہیں دور وقت کی گردش
مگر مدار پہ اپنے ہی چل رہا ہوں میں

کسی کہانی کی صورت سنایا جانے لگا
لبوں پہ لفظ کی صورت مچل رہا ہوں میں

مجھے بھی دشت کی صورت کہیں قرار نہیں
اِسی لیے تو بگولوں میں چل رہا ہوں میں

ہے میری آرزو ، منظر کو روشنی بخشوں
سو دیپ بن کے اندھیروں میں جل رہا ہوں میں

اِسی لیے میں ادھورا ہوں ، نا مکمل ہوں
کسی کے دستِ ہُنر سے پھسل رہا ہوں میں

میں اپنی ذات میں اشرفؔ ہوں اِک سمندر سا
سو اِضطراب میں حد سے نکل رہا ہوں میں

چلتا ہوں روز و شب مَیں ڈگر کے بغیر بھی
منزل کی ہے تلاش سفر کے بغیر بھی

گھر میں پڑا پڑا ہی تھکن سے نڈھال ہوں
پاؤں میں آبلے ہیں سفر کے بغیر بھی

میری بصیرتوں نے مجھے بے بصر کیا
تم صاحبِ نظر ہو نظر کے بغیر بھی

سر پر جو چھت نہیں ہے مرے، آسماں تو ہے
دیوار و در میں رکھتا ہوں گھر کے بغیر بھی

مجھ پر کرم ہے خاص خدائے سخن ترا
میں معتبر ہوں آج ہنر کے بغیر بھی

جاں دے کے میں نے اپنی انا کو بچا لیا
دستار آج رکھتا ہوں سر کے بغیر بھی

آنکھوں میں اشک خشک ہوئے ہیں تو کیا ہوا
رو لوں گا میں تو دیدۂ تر کے بغیر بھی

مالک ! اگر تو چاہے تو رہ سکتی ہے رواں
یہ کائنات شمس و قمر کے بغیر بھی

ماں باپ کی دعاؤں کا اشرفؔ یہ فیض ہے
چھاؤں ہے میرے سر پہ شجر کے بغیر بھی

فلک سے دور نیا آسماں بناتے ہوئے
ستارہ خاک ہوا کہکشاں بناتے ہوئے

میں خود ہی جلنے لگا سُرخ آگ میں اپنی
دُھویں کے ساتھ دیے کا نشاں بناتے ہوئے

ملی نہیں مجھے یونہی مراد کی منزل
میں خود غبار ہوا کارواں بناتے ہوئے

جدا کیا گیا خوابوں کو آنکھ سے پہلے
ہماری شب کو شبِ امتحاں بناتے ہوئے

کبھی تو عشق مرا مجھ کو لا زوال کرے
کہ مٹ رہا ہوں اِسے جاوداں بناتے ہوئے

تمام عمر میں اِک گھر نہ بن سکا مجھ سے
میں خرچ ہوتا رہا بس مکاں بناتے ہوئے

مجھے جو آیا فسانہ گری کا فن اشرفؔ
میں خود کہانی ہوا داستاں بناتے ہوئے

ہوا زمیں سے جدا اور آسماں سے الگ
تجھے میں چھوڑ کے ہونے لگا جہاں سے الگ

پڑا ہوا ہوں اِک ایسے عجیب عالم میں
جو ماورائے مکاں ہے تو لا مکاں سے الگ

پھر اور ہی کوئی قصہ نیا نکل آیا
میں کر رہا تھا ترا ذکر داستاں سے الگ

اُسے ملے گا یقیناً عذاب مٹی کا
کرے گا جو بھی مجھے میرے خاکداں سے الگ

تری طرح میں تری زندگی میں شامل ہوں
کرے گا دوست مجھے تو کہاں کہاں سے الگ

میں روز خواب کی دُوری سے دیکھتا تھا جسے
وہ تارا آج نظر آیا کہکشاں سے الگ

ہمیشہ مجھ کو اُسی میں رکھا گیا اشرفؔ
جو ایک صف ہے یہاں بزمِ دوستاں سے الگ

قریۂ بے مثال میں گم ہوں
شہرِ شامِ وصال میں گم ہوں

آئینہ ہوں، سو ایک مدت سے
عکس کے خد و خال میں گم ہوں

وقت آگے نکل گیا اور میں
گردشِ ماہ سال میں گم ہوں

گم کبھی بھی نہیں ہوا خود میں
یہ جو تیرے خیال میں گم ہوں

تھام کر ہاتھ اِک خوشی کا میں
دشتِ رنج و ملال میں گم ہوں

حال تیرا بھی پوچھ لوں گا کبھی
میں ابھی اپنے حال میں گم ہوں

جس نے مٹی بنا دیا اشرفؔ
زیست کے اُس وبال میں گم ہوں

جانے جھوٹے ہیں یا کہ سچے خواب
آنکھ میں اُترے کیسے کیسے خواب

ایک عالم میں روشنی کرتے
تم نے دیکھے نہیں ہیں میرے خواب

ایک دریا میں اِک سفینہ ہے
اور سفینے میں پار اُترتے خواب

ہیں فروزاں سرِ فلک تارے
اور زمیں پہ مرے چمکتے خواب

اب ضرورت نہیں چراغوں کی
گھر کو روشن کریں گے میرے خواب

عالمِ بے خودی میں بھی اکثر
دیکھتا ہوں میں سوچے سمجھے خواب

وقت سے آگے دوڑنے والے
چھوڑ آئے کہیں پہ پیچھے خواب

سانجھ دُکھ سُکھ کی جب سے ختم ہوئی
دیکھتے ہیں سب اپنے اپنے خواب

ایسے ٹُوٹا ہے آئینہ دل کا
کرچیوں میں پڑے ہیں بکھرے خواب

کر رہا ہوں کسی کے نام اشرفؔ
اپنی اُمید ، اپنے سارے خواب

کچھ ایسا زادِ حقیقت مرے گمان میں تھا
میں امتحاں سے گزر کر بھی امتحان میں تھا

شجر اُداس کہ پتّے بھی ساتھ چھوڑ گئے
اور اس پہ رنج کہ صحرائے بے امان میں تھا

نہ اب بدن میں حرارت، نہ زندگی کی رمق
کل ایک بجھتا شرارہ، کہ خاکدان میں تھا

ہو جس طرح سے کوئی ٹوٹتا ہو شیشہ
کچھ ایسا شور ابھی میرے جسم و جان میں تھا

تمہارے درد کی نسبت سے معتبر ٹھہرا
وگرنہ ذکر کہاں میرا داستان میں تھا

جسے بھٹکتا ہوا تم نے آنکھ میں دیکھا
وہی ستارہ کبھی روشن آسمان میں تھا

بدن سے طائرِ جاں جب رِہا ہوا اشرفؔ
تو ایک نشۂ خوشی سے بھری اُڑان میں تھا

اِک دیے نے کہا ستارے سے
آ بچا لوں تجھے خسارے سے

پھر بلاتا ہے دشت کی جانب
ایک دریا مجھے اشارے سے

تم بھی تصویر میں چلے آئے
میں بھی نکلا نہیں نظارے سے

شب تو کٹتی ہے آنکھوں آنکھوں میں
دن گزرتا نہیں گزارے سے

میری مٹی کو عشق نے اشرفؔ
جا ملایا ہے اِک ستارے سے

رنجِ ہستی کے اُٹھانے کے لیے آیا ہوں
میں یہاں ہجر کمانے کے لیے آیا ہوں

جن چراغوں نے ہواؤں کی غلامی کی ہے
اُن چراغوں کو بجھانے کے لیے آیا ہوں

بس یہی سوچ کے، ہو جائے نہ وہ شہر مثال
دشت کو دشت بنانے کے لیے آیا ہوں

تجھ سے ہونے کا نہیں کارِ محبت تنہا
سو ترا ہاتھ بٹانے کے لیے آیا ہوں

میں گئے وقت کی صورت نہیں آنے والا
بس یہی بات بتانے کے لیے آیا ہوں

شاعری گویا کہ ہے دشت نوردی اشرؔف
سو یہاں خاک اُڑانے کے لیے آیا ہوں

دشت ہوں، کیوں نہ سرابوں کی روانی دیکھوں
پیاس جب حد سے بڑھے، آنکھ میں پانی دیکھوں

میرے اِس خواب کی تعبیر کوئی بتلائے
جسم سے لپٹی ہوئی رات کی رانی دیکھوں

مجھ کو حصوں میں ہی تقسیم اگر ہونا ہے
کون سی جا سے ہے دیوار اُٹھانی، دیکھوں

یہ جو اِک شام مِرے پہلو میں آ بیٹھی ہے
آشنا میری نئی ہے کہ پرانی، دیکھوں

مجھ کو ہونا ہے اگر خوابِ عدم کا حصہ
کون سے موڑ پہ ہے میری کہانی دیکھوں

دل یہ ہو جاتا ہے کچھ اور بھی غم سے بوجھل
ذہن ترے جب بھی کوئی شام سہانی دیکھوں

آئینہ خانہ تصور کا سجا کر اشرف
دل یہی چاہے کہ تصویرِ جوانی دیکھوں

جب بھی وہ مسکرانے لگتا ہے
کرب چہرے پہ چھانے لگتا ہے

آئینے سے نظر ملاؤں تو
اصل چہرہ دِکھانے لگتا ہے

دیکھ لیجئے یہ شام کا منظر
کچھ ہی پل میں ٹھکانے لگتا ہے

مجھ میں اِک قیس ہے جو وحشت میں
خاکِ صحرا اُڑانے لگتا ہے

دل میں بن کر دِیا کسی کا خیال
رات کو جھلملانے لگتا ہے

تم بجھاتے ہو ایک جاں کا چراغ
وہ ہزاروں جلانے لگتا ہے

صرف اِک عشق کو بچانے میں
میرا سب کچھ ٹھکانے لگتا ہے

میں ہو کے بے کراں سمٹا ہوا ہوں
سمندر تھا مگر دریا ہوا ہوں

سفر قسمت میں ہے، منزل نہیں ہے
خزاں میں شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں

مجھے میرے خدا! مجھ سے ملا دے
میں اپنے آپ سے بچھڑا ہوا ہوں

ابھی محفوظ ہوں دستِ ہوا میں
ابھی میں طاق میں رکھا ہوا ہوں

جو میرا مسئلہ ہرگز نہیں تھا
اُسی میں آج تک اُلجھا ہوا ہوں

خیالِ یار کی خوشبو سے اشرؔف
سرِ صحرائے جاں مہکا ہوا ہوں

خود سے اِتنے ہی آشنا ہیں ہم
گھر میں ہیں اور لا پتا ہیں ہم

جانے کن بے یقین لوگوں کے
لب سے نکلی ہوئی صدا ہیں ہم

کیوں دیا نم ہماری مٹی کو
کوزہ گر سے بہت خفا ہیں ہم

ہم کہ مقروض اپنی مٹی کے
خاکساری کی اِنتہا ہیں ہم

ہم نہ اِمروز کی نہ فردا کی
ہاں! گئے وقت کی صدا ہیں ہم

گو نہیں ہیں کسی بھی منظر میں
ہاں مگر پھر بھی جا بجا ہیں ہم

وہ ستارہ بھٹک نہیں سکتا
جس ستارے کے رہنما ہیں ہم

آئینے پر پڑے ہوئے اشرفؔ
داغ سے بڑھ کے بد نما ہیں ہم

سایہ یا دیوار سمجھ
مجھ کو میرے یار سمجھ

میرے غم کی بابت جان
اور میرا آزار سمجھ

دل کی خبریں دیتا ہے
چہرے کو اخبار سمجھ

اپنی آنکھ کے آنسو کو
تاروں کا سردار سمجھ

مشکل میں کام آئے گا
دل کا کاروبار سمجھ

تجھ میں بھی موجود ہے وہ
خود اپنے اسرار سمجھ

اور کوئی بھی تام نہ دے
پیار کو اشرف پیار سمجھ

لفظ کو موجِ معانی سے الگ رکھتا ہے
وہ مجھے میری کہانی سے الگ رکھتا ہے

مجھ کو مجھ سے کبھی ملنے بھی نہیں دیتا ہے
یعنی پانی کو ہی پانی سے الگ رکھتا ہے

کھیلتا اب بھی ہے وہ کھیل لڑکپن والے
اور بچپن کو جوانی سے الگ رکھتا ہے

رام کی طرح دیا کرتا ہے بن باس مجھے
اور مجھ راجہ کو رانی سے الگ رکھتا ہے

میں تو دریائے محبت ہوں بہے جاؤں گا
تُو عبث مجھ کو روانی سے الگ رکھتا ہے

جو نظر آتا ہے اشرفؔ ہمیں ہر منظر میں
خود کو ہر ایک نشانی سے الگ رکھتا ہے

بدن میں درد کی جو کیفیت نئی ہوئی ہے
دراصل مجھ سے مری اِن دلوں ٹھنی ہوئی ہے

خیال و خواب سے بڑھ کر نہیں ہے کچھ اِس میں
سروں پہ چادرِ افلاک جو تنی ہوئی ہے

اُتار لایا ہوں گرچہ میں جلتے سورج کو
پہ گھر کی تیرگی کچھ اور بھی گھنی ہوئی ہے

میں بجھ رہا ہوں ، رہے گی مگر قیامت تک
مرے وجود سے جاری جو روشنی ہوئی ہے

فراز سر کو مرے ہو گیا نصیب اشرفؔ
کہ جب سے حق میں مرے نیزے کی انی ہوئی ہے

خاموشی سے کلام کیا اور چپ رہا
میں نے سخن مُدام کیا اور چپ رہا

اے کوزہ گر! بتا تو سہی، تُو نے کس لیے
مٹی کو میری خام کیا اور چپ رہا

غم کو خوشی کے ساتھ ملانا پڑا مجھے
سو میں دن کو شام کیا اور چپ رہا

تاریک شب ستاروں سے بھرنے کے واسطے
اشکوں پہ میں نے کام کیا اور چپ رہا

میں نے کسی سے بھی نہ کیا غم کا تذکرہ
شعر و سخن کو عام کیا اور چپ رہا

پہلے بنایا میں نے تری یاد کو اِمام
پھر رات بھر قیام کیا اور چپ رہا

تاریکیوں سے لڑتے ہوئے اِک چراغ نے
سورج کا اہتمام کیا اور چپ رہا

شامِ وصال میرے مقدر میں تھی، مگر
اِک ہجر اپنے نام کیا اور چپ رہا

اشرفؔ نہ کہہ سکا میں اُسے جا کے حالِ دل
بس دُور سے سلام کیا اور چپ رہا

حشر یوں بھی اُٹھا گیا پانی
پتھروں کو رُلا گیا پانی

کچھ لہو سے کلام کرنا تھا
سو رگوں میں سما گیا پانی

ہم نے کی تھی ذرا سی بے قدری
طیش میں اِس پہ آ گیا پانی

جیسے درویش محوِ رقص کوئی
دم بہ دم ناچتا گیا پانی

کشتیِ نوحؑ بھیج دے یا رب!
میری بستی میں آ گیا پانی

اِک سمندر تھا معترض اِس پر
کیوں گھڑے میں بھرا گیا پانی

جو تجھے قرطاسِ ارض پر لکھے
لفظ سارے مٹا گیا پانی

بھوک اِس کی مٹا دے اے مالک!
شہر کے شہر کھا گیا پانی

میری آنکھوں سے جو لہو نکلا
اُس کو اشرفؔ کہا گیا پانی

ہیں خالی ہاتھ اور دامن تہی بھی
عجب ہم کو ملی دل کی شہی بھی

ہمیں کچھ راس سی آنے لگی ہے
حوادث سے بھری یہ زندگی بھی

کہیں اپنے اجالوں کو نہ کھا لے
اندھیروں سے لپٹتی روشنی بھی

دیا روشن اگرچہ طاق میں ہے
مگر ہوتی نہیں کم تیرگی بھی

مرا عکسِ دروں محفوظ رکھنا
ترا عاشق بھی ہوں میں، حیرتی بھی

محبت میں بہت ممکن ہے اشرفؔ
ہماری جان لے لے دل لگی بھی

خوش بخت ہوں شاید میں سکندر سے زیادہ
غم مجھ کو میسّر ہیں مقدر سے زیادہ

وحشت کبھی تم نے نہیں کی ، تم کو خبر کیا
ملتا ہے سکوں دشت میں کیوں گھر سے زیادہ

جس دل میں محبت کی رمق بھی نہ ہو موجود
رکھتا نہیں وقعت کسی پتھر سے زیادہ

مجھ کو مرے مولا ! مری اوقات میں رکھنا
پھیلاؤں نہ پاؤں کبھی چادر سے زیادہ

عزت سے جیا ہوں، سو میں عزت سے مروں گا
دستار ہے یہ پیاری مجھے سر سے زیادہ

ممکن ہے کسی دن تجھے پتھر سے نکالوں
ہاتھوں میں ہنر ہے مرے آزر سے زیادہ

دنیا! تجھے چاہوں تو میں اشکوں میں بہا دوں
پانی ہے اِن آنکھوں میں سمندر سے زیادہ

باہر سے جو دیکھو تو میں بالکل ہوں سلامت
اشرفؔ ہوں شکستہ مگر اندر سے زیادہ